باسمہٖ تعالیٰ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود!
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے

نہ ہنگاموں سے نہ تعزیرات سے

پرویز

قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے

(نہ ہنگاموں سے، نہ تعزیرات سے)

پرویز صاحب کی ساری عمر "محاذ آرائی" میں بسر ہوئی ہے۔ یہ محاذ آرائی ہنگامہ خیزی کی نہیں۔ نظریات کی جنگ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران انہیں نیشنلسٹ علماء کے خلاف محاذ قائم کرنا پڑا۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ (۱) قومیت کا مدار، وطن کا اشتراک ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ اور (۲) اسلام پر، ہر قسم کی حکومت کے تابع، عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ ان کے برعکس پرویز صاحب کا (قرآنِ کریم کی روشنی میں) نظریہ یہ تھا کہ اسلام میں قومیت کا مدار ایمان کا اشتراک ہے نہ کہ، وطن۔ رنگ۔ نسل۔ زبان وغیرہ کا اشتراک۔ اور اسلام نام ہے قرآنِ کریم کے اصول، اقدار اور قوانین کے عملاً نافذ کرنے کا، جو صرف اپنی آزاد مملکت میں ممکن ہے۔ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد یہی قرآنی حقیقت تھی، جسے کامیابی نصیب ہوئی اور ہمیں، اس قسم کی مملکت قائم کرنے کے لئے ایک خطۂ زمین مل گیا۔

تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد پرویز صاحب نے اربابِ اقتدار سے کہا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ہمارا سارا وقت اور توانائی اس جنگ کے لڑنے میں صرف ہو گئے تھے اور وہاں اتنی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی کہ مسلمانوں میں وہ فکری تبدیلی پیدا کی جا سکے جس سے وہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم بن سکتے، اور اس قابل ہو سکتے کہ اس خطۂ زمین میں اس انداز کی مملکت قائم کر سکتے جو اس کے حصول کا مقصود تھی۔ (انہوں نے کہا کہ) قوم کے بڑے بوڑھوں کے ذمہ تو یہ فریضہ عائد کیجئے کہ وہ اس خطۂ زمین کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان میں وہ فکری تبدیلی پیدا ہو جائے جس سے اس مقصد کا حصول ممکن ہو جس کے لئے یہ جداگانہ مملکت قائم کی گئی ہے

لیکن ان کی اس آواز کو، جسے وہ مسلسل اور متواتر دہراتے رہے، کسی نے درخورِ اعتناء نہ سمجھا۔ اور یہاں کی نئی نسل کو بے زمام چھوڑ دیا کہ وہ جو نسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے۔ اس کے ساتھ ہی (ہماری بدقسمتی سے) وہ تمام عناصر ہجوم کر کے پاکستان میں در آئے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی سر توڑ مخالفت کی تھی اور آخر الامر شکست اٹھائی تھی۔ ان کا مقصد اپنی شکست کا انتقام لینا اور پاکستان کو ناکام بنا کر

یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی مخالفت میں حق بجانب تھے۔ ان کا حربہ ایسے حالات پیدا کرتے رہنا تھا جس سے ملک خلفشار اور انتشار کا شکار ہوتا رہے۔ ہنگامے اور فسادات برپا ہوتے رہیں۔ اور لاقانونیت پھیلتی رہے۔ "سپر پاورز" اس قسم کے مواقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس فتنہ کو برقرار رکھنے اور فروغ دینے میں ہر ممکن مدد کی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح آئے دن (تبلیغ کے بہانے) ان ممالک کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ مذہب کے نام اور اسلام کے نقاب میں ہوتا رہا۔ اس کا واحد اور مؤثر علاج وہی فکری تبدیلی تھی لیکن اس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی اور تعزیرات کے ذریعے ان ہنگامہ آرائیوں کو دبانے کی کوشش کی جاتی رہی جو ظاہر ہے کہ ناکام رہی۔

یہ ہنگامہ آرائیاں ویسے تو معمول کے مطابق مسلسل رواں دواں رہتی تھیں لیکن وقتاً فوقتاً ان کی رفتار میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، ان میں بحرانی کیفیت پیدا کر دی جاتی تھی۔ پرویز صاحب ایسے مقامات پر قوم کو خاص طور پر مخاطب کرتے اور کہتے کہ قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگامہ آرائیوں سے نہیں۔ اور ارباب اقتدار سے کہتے ہیں کہ معاشرہ کی اصلاح تعزیرات سے نہیں ہو سکتی۔ ذہنیت کی تبدیلی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب ۱۹۶۸-۶۹ء میں ملک میں اسی قسم کا بحران پیدا ہوا تو انہوں نے ایک خصوصی خطاب کے ذریعے اس حقیقت کو نمایاں کیا۔ پھر جب ۱۹۷۷ء میں فسادات کا یہ سیلاب دوبارہ اُمنڈا تو اس خطاب کا اعادہ کیا گیا۔ اب ملک پھر تشتت و اضطراب کا شکار ہو رہا ہے تو ہم نے مناسب سمجھا کہ اس خطاب کو (پرویز صاحب کی نظرثانی کے بعد) ایک بار پھر شائع کیا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس خطاب میں، مرض کی علامات کے علاج پر زور نہیں دیا گیا۔ علتِ مرض کی تشخیص کی گئی ہے اور ایسے حقائق کو سامنے لایا گیا ہے جن کا تعلق بنیادی طور پر سیاستِ مدن اور عمرانیات سے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اربابِ دانش و بینش اس کی اشاعت کو مفید پائیں گے۔

(طلوعِ اسلام)

خطاب

حیوان اور انسان میں ایک (اور میرے نزدیک سب سے اہم، بنیادی) فرق یہ ہے کہ انسان کو عقل و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حیوان کے ہر عمل کا جذبۂ محرکہ، جبلّی تقاضا (INSTINCTIVE URGE) ہوتا ہے ..... اسی کو، آگے بڑھ کر انسانی زندگی میں جذبات سے تعبیر کیا جاتا ہے ——— حیوانات کے برعکس، انسان کے سامنے جب کوئی معاملہ آئے تو اس کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور و فکر کرے، اس کے موافق اور مخالف پہلوؤں کا، دلائل و براہین کی رو سے موازنہ کرے۔ تجربات اور مشاہدات کے فراہم کردہ نتائج کو سامنے رکھ کر، اس کے انجام و عواقب پر نگاہ ڈالے، اور اس طرح، امکان بھر تدبّر و تفکر کے بعد، نہایت ٹھنڈے دل سے کسی فیصلے پر پہنچے۔ حیوان کے پیشِ نظر مقصد کے راستے میں جب کوئی موانعات آتے ہیں تو اس کے جذبات میں شدت آ جاتی ہے۔

بالفاظِ دیگر یوں کہئیے کہ اس کا غصّہ تیز ہو جاتا ہے ـــــ اس لئے کہ اس کے پاس، اس کے سوا، مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی انسانیت کا تقاضا ہے کہ جب اس کی راہ میں دشواریاں حائل ہوں تو ان پر اور بھی زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرے اور کامل سکون و اطمینان سے ان کا حل سوچے۔

حیوانات کے جبلّی تقاضوں پر فطرت کی طرف سے کنٹرول عائد ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا خونخوار درندہ بھی جبتک اسے اپنی حفاظت کے متعلق کسی خطرہ کا احساس نہ ہو، یا اسے بھوک نہ ستائے، کسی پر حملہ نہیں کرتا جب کسی بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر اسے اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ باقی ماندہ چارہ کون کھا رہا ہے حتیٰ کہ حیوانات کا جنسی تقاضا بھی ـــــ جسے جبلّی تقاضوں میں شدید ترین تصوّر کیا جاتا ہے ـــــ فطرت کے اشارے کے بغیر بیدار نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کے جبلّی تقاضوں، یعنی جذبات پر، فطرت نے اپنا کنٹرول عائد نہیں کیا۔ اسے اپنے جذبات پر خود کنٹرول عائد کرنا پڑتا ہے۔

فطرت کا کنٹرول نہیں

اور یہ کنٹرول عقل و فکر کی رو ہی سے عائد کیا جا سکتا ہے۔ لفظ عقل کے بنیادی معنی روکنے کے ہیں جس رسّی سے اونٹ کے گھٹنے کو باندھ دیا جاتا تھا کہ وہ بھاگ نہ جائے، عرب اسے عقال کہتے تھے۔ جب اونٹ چلتا تو وہ اس رسّی کو کھول کر اپنے سر پر لپیٹ لیتے کہ بوقتِ ضرورت آسانی سے ہاتھ میں آجائے۔ رفتہ رفتہ یہ رسّی عربوں کے لباس کا جزو بن گئی۔ اسے بھی عقال کہا جاتا ہے۔ بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ عقل کا فریضہ یہ تھا کہ وہ انسانی جذبات کو حد سے بڑھنے سے روک دے۔ یہ چیز خاصۂ انسانیت ہے۔ بنا بریں عقل و فکر اور دانش و بینش، باعثِ شرفِ آدمیت اور موجبِ جوہرِ انسانیت ہیں، اور جبلّی تقاضوں (جذبات) کی بے باکی، حیوانیت سے بھی پست سطحِ زندگی کی مظہر۔

جہاں تک طبیعی قوتوں کا تعلق ہے، انسان، حیوانات کے مقابلے میں کمزور واقع ہوا ہے ـــــ نہ اسے ہاتھی جیسی طاقت حاصل ہے، نہ شیر جیسی قوتِ درندگی۔ نہ یہ ہرن جتنا تیز دوڑ سکتا ہے، نہ عقاب جیسا بلند اڑ سکتا ـــــ لیکن وہ ان تمام حیوانات کو اپنی عقل و فراست کے زور سے مغلوب اور تابع فرمان بنا سکتا ہے۔

فطرت کی طرف سے سب انسان، یکساں واجب التکریم پیدا ہوئے تھے لیکن جب انسانی معاشرہ میں "میری اور تیری" کی تفریق و تخصیص پیدا ہوئی تو ان لوگوں نے، جو اپنی ہوسِ اقتدار کو حدود فراموش اور اپنے جذبۂ حرص و آز کو قیود ناآشنا بنانا چاہتے تھے، اس سوال پر غور کیا کہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو کس طرح اپنا تابع فرمان بنا کر ان کی محنت کے ماحصل کو غصب (EXPLOIT) کیا جائے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانات کو اس لئے مغلوب کر لیا جا سکتا ہے کہ وہ عقل و فکر سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے دوسرے انسانوں کو اپنا مطیع اور فرمان پذیر بنانے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں کسی طرح عقل و فکر سے بیگانہ بنا دیا جائے۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج، اور رفتہ رفتہ مصلوب کر دیا جائے۔

آپ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانوں میں، باہمی کش مکش یعنی عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS) مسلسل چلی آرہی ہے۔ حاکم و محکوم، آمر و مامور، مطاع و مطیع، مقتدی و مقتدی، آجر و مستاجر، محتاج و مستغنی کی تفریق و تمیز، اسی کش مکش باہم کے مختلف مظاہر ہیں۔ جو زیادہ زیرک اور چالاک تھے انہوں نے ایسے انداز اور طریقے وضع کئے جن سے ان لوگوں کو جو نسبتاً کم عقل و فہم کے مالک تھے، اپنے دامِ تزویر میں لے آئے، اور اس طرح گوشۂ سیاست میں حاکم و آمر، دنیائے مذہب میں مطاع و مقتدی اور جہانِ معیشت میں رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ اور اَن داتا بن بیٹھے۔ اس کے بعد ایسا انتظام کیا کہ محکوم و مطیع و محتاج طبقہ کی فکری صلاحیتیں اُبھرنے نہ پائیں۔ اس نظام کو جس کی رو سے انسانوں کی عقل و فکر کے چراغ گل کئے جاتے ہیں، "مذہب" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ اس لفظ کو سُن کر شاید چونک اُٹھیں، کیونکہ مذہب کا تصوّر

اسے مذہب کہتے ہیں

تو یہاں طور پر کچھ اور ہوتا ہے لیکن جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے ——— مذہب، نجات حاصل کرنے کے ذریعہ ہی کا نام نہیں۔ یہ تو مذہب کا ایک گوشہ ہے۔ ہر وہ نظام جو عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا تابع فرمان بنائے مذہب کہلائے گا۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، اس نظام کے خلاف چیلنج ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہے کہ

دینِ خداوندی

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ .... (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ——— خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت اور نبوّت بھی حاصل کیوں نہ ہو ——— کہ وہ دوسرے لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں، بلکہ میرے محکوم اور فرمان پذیر بن جاؤ۔

یہ دین کا سب سے پہلا اعلان ہوتا ہے جسے وہ بغرضِ اختصار، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، کے نظریۂ حیات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ جب دنیائے انسانیت میں ایسا عظیم انقلاب لائے گا تو وہ سب سے پہلے، اس اصل و بنیاد کو اکھیڑے گا جس پر انسانی تغلب، استبداد اور استحصال کی عمارت استوار ہوتی ہے ——— یعنی فرعونیت (سیاسی استبداد)، ہامانیت (مذہبی اقتدار) اور قارونیت (معاشی استحصال) کی عمارت ——— وہ اُن اغلال و سلاسل کو توڑے گا جن میں انسانی عقل و فکر کو جکڑ دیا گیا تھا۔ اور ان بوجھل بسلوں کو اٹھا کر پھینک دے گا جن کے نیچے عقل و شعور کو دبا کر مفلوج کر دیا گیا تھا۔ قرآنِ کریم نے جب حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) تو اس کا مفہوم یہی تھا۔ یعنی انسانوں کو ان شکنجوں سے آزاد کر کے، وہ ایسا انتظام کرے گا کہ ان کی فکری صلاحیتیں نشوونما

پائی ہوئی بلند سے بلند تر ہوتی جائیں تاکہ کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم و مطیع بنا کر، ان کی محنت کو غصب نہ کر سکے۔

قرآنِ کریم نے (سورۃ البلد میں) دین کی غرض و غائت، اس کے منتہیٰ و مقصود کو دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ پہلے اس نے کہا کہ صحیح راستہ وہی ہے جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ یعنی الدین۔ لیکن یہ راستہ اَلْعَقَبَۃُ ہے۔ یعنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ اس کے بعد کہا کہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَۃُ ـــــ یہ اَلْعَقَبَۃُ کیا ہے؟ کہا فَكُّ رَقَبَۃٍ (۹۰/۱۳) نوعِ انسانی کو غلامی کے پھندوں سے آزاد کرانا۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کو آزادی دلانے کی صورت یہ ہوگی کہ جن قوتوں نے ان کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہو، انہیں مغلوب کر کے ان محکوموں اور غلاموں کی صلاحیتوں کو اذنِ بال کشائی دیا جائے۔

عقل و فکر کی عظمت

آپ قرآنِ کریم کو اٹھا کر دیکھئے۔ اس کے ورق ورق پر عقل و شعور کی اہمیت اور فہم و فراست کی عظمت تابندہ حروف میں لکھی ملے گی۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ آؤ! تمہیں بتائیں کہ جہنم کے مستوجب کون لوگ ہیں۔ وہ: لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا ـ ـ ـ ـ جو سینے میں دل (سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) تو رکھتے ہیں، لیکن عقل و فکر سے کام نہیں لیتے؛ وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا ـ ـ ـ ـ جو آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا ـ ـ ـ ـ جو کان تو رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ ـ ـ ـ ـ یہ لوگ، انسان نہیں حیوانات کے مانند ہوتے ہیں۔ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ـ ـ ـ ـ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ ذرائع علم رکھنے کے باوجود بے خبر اور بے علم رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والوں سے اس کا داروغہ پوچھے گا کہ تم کس جرم کی پاداش میں یہاں آ گئے؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ اس جرم کی پاداش میں کہ جو لوگ ہم سے عقل و فکر سے کام لینے کے لئے کہتے تھے، ہم ان کی بات نہیں سنتے تھے۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ۔ (۶۷/۱۰) اگر ہم ان کی بات سنتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہلِ جہنم میں کیوں ہوتا۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے والے ایک تو وہی ہیں جن کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو مستبد قوتوں نے سلب کر رکھا ہو، ان کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو عقل و فکر سے کام لینے کے بجائے اپنے بے باک جذبات کے پیچھے چلیں۔ ان کا شمار بھی اہلِ جہنم میں ہوتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں ہے کہ ان لوگوں سے کہا جائے گا کہ تمہیں متنبہ کیا گیا تھا کہ اپنے بے باک جذبات کے پیچھے نہ لگنا اور عقل و فکر سے کام لینا۔ تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ جہنم ہے جس سے تمہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا۔ (۳۶/۶۲) آسمانی انقلاب کے اس پیامبرِ عظیم نے اپنی دعوت پیش کی تو کہا کہ: اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کے راستے کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا

کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ تم اس پر عقل و فکر کی رُو سے غور کرو۔ علم و بصیرت کی روشنی میں اسے پرکھو۔ اگر تم اس طرح اس کی صداقت پر مطمئن ہو جاؤ تو قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے اس کا اعتراف کرو (اسے ایمان کہا جاتا ہے) اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں، جبر و استبداد نہیں۔ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو، کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ واضح

دین میں جبر نہیں

رہے کہ قرآن کریم نے جب کہا ہے کہ لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (۲/۲۵۶) تو اس کے یہی معنی نہیں کہ تم سے دین بزورِ شمشیر نہیں منوایا جائے گا۔ یہ تو جبر و اکراہ کی ایک شکل ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جور و اکراہ یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو مفلوج کرکے کسی سے کوئی بات منوالی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اپنے آپ کو فوق الفطرت معجزات اور محیّر العقول کرامات کے زور سے نہیں منواتا۔ قرآن کے اوّلین مخاطب، جو مذہب کے خوگر تھے، رسول اللہؐ سے بار بار معجزات طلب کرتے رہے اور حضورؐ ان سے ہر بار یہی فرماتے رہے کہ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر دیکھو کہ میری دعوت، حق و صداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کرکے، تم سے اپنی بات منوالوں۔ تم عجیب قسم کے انسان ہو؟ چنانچہ آپ ان سے تاکیداً فرماتے کہ انسانی زندگی کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو کہ: لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس بات کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ۔ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ؁ (۱۷/۳۶)۔ سماعت، بصارت اور فہم و ادراک، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ تم نے پوری تحقیق کے بعد ایسا فیصلہ کیا تھا؟ رسول اللہؐ اپنی دعوت کو عقل و بصیرت کی رُو سے پیش فرماتے اور اپنے مخالفین سے کہتے کہ: هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ؁ (۲/۱۱۱) تم اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرو۔ دھاندلی سے نہ میں کوئی بات منوانا چاہتا ہوں، نہ تم منواؤ، میں بھی اپنی بات کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہوں، تم اگر اسے رد کرتے ہو تو تم بھی دلیل و برہان کی رُو سے ایسا کرو۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم عقل و فکر کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ سبا کی ایک آیت ایسی جامع ہے جس میں قرآن نے تمام تفاصیل کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا

سوچا کرو

ہے، اور اگر کہا جائے کہ وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ نبی اکرمؐ عمر بھر اپنی دعوت کو پیش کرتے رہے، اس کے لئے آپؐ نے مختلف طرق و اسالیب اختیار فرمائے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم کے متنوع گوشے ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اس کی تعلیم کی وسعتیں حدود فراموش اور اس کے موضوع قیود ناآشنا ہیں۔ لیکن

آپ غور کیجئے کہ اس قسم کی تعلیم کا مبلغ اپنے مخاطبین سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات: قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ..... آپ اندازہ لگائیے کہ وہ بات کس قدر اہم اور بنیادی ہوگی۔ وہ ایسی بات ہوگی جس میں اسلام کی ساری تعلیم کا نچوڑ آجائے ــــــ ظاہر ہے کہ ایسی بات سننے کے لئے ہر مخاطب آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ ان سے کہتے ہیں کہ: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى۔ اس بات کے سننے کے لئے اگر تم سب کے سب رُکنا نہیں چاہتے تو تمہاری مرضی۔ تم ایک ایک دو دو کر کے ہی رُک جاؤ، اور اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ جب آپؐ نے اس طرح ان کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کر لیا تو فرمایا کہ وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ: ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔ (۳۴/۴۶) تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو۔ عقل و بینش سے کام لیا کرو۔ بس یہی تھی وہ ایک بات جو میں تم سے کہنا چاہتا تھا۔ اگر تم نے عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا تو میرا مرحلہ آسان ہو گیا۔

مومن کسے کہتے ہیں؟

آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے مومن کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؛ یعنی وہ خصوصیت جس کے بغیر ایک انسان، مومن نہیں کہلا سکتا۔ سنیئے اور غور سے سنیئے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)

مومن وہ ہیں کہ، اور تو اور، جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

یہ ہے مومن کی بنیادی خصوصیت ــــــ ہمارے ہاں لفظِ ایمان کا "انگریزی زبان میں ترجمہ (FAITH) کیا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایمان (FAITH) یعنی اندھی عقیدت نہیں۔ یہ اس اعترافِ حقیقت کا نام ہے جو دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، عقل و فکر کی رُو سے کیا جائے۔ اسے آپ (CONVICTION) کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی بنیاد (FAITH) یعنی اندھے یقین پر ہوتی ہے۔ دین علیٰ وجہ البصیرت (BY CONVICTION) اختیار کیا جاتا ہے۔ مذہب کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ:۔

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اور دین یہ کہتا ہے کہ سالک تو ایک طرف، تم خدا کی بات بھی سوچے سمجھے بغیر نہ مانو۔ اس سے واضح ہے کہ دین، درحقیقت، مذہب کے خلاف چیلنج ہے۔ ضمناً، اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ میں نے جو اپنی کتاب کا نام (ISLAM—A CHALLENGE TO RELIGION) رکھا ہے تو وہ قرآن ہی کی پیش کردہ حقیقت پر مبنی ہے۔

جذبات، عقل اور وحی

قرآن کریم نے جذبات اور عقل اور وحی کے تعلقات کو، دو آیات میں، اپنے مخصوص حسنِ ایجاز کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ۔ کیا تُو نے اس شخص، یا اس قوم کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ ۔ وہ علم و بصیرت رکھنے کے باوجود صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۔ اور اس کے سُننے، دیکھنے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو گئیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ (۴۵/۲۳) جو اس طرح جذبات سے مغلوب ہو جائے اسے صحیح راستہ کون دکھا سکتا ہے؟ یعنی جب انسان جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا علم اسے کچھ فائدہ نہیں دیتا، اور اس کی فکر و دانش کی صلاحیتیں ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ تم تاریخ کے شواہد پر غور کرو۔ اس میں تمہیں ایسی قومیں دکھائی دیں گی جو بڑی بڑی وسیع و عریض سلطنتوں کی مالک تھیں۔ نہایت درخشندہ و تابناک تہذیب کی حامل تھیں۔ علم و فضل میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بڑی نمایاں تھیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے اپنے علم و عقل کو مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع نہ رکھا۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۔۔۔۔۔ (۴۶/۲۶) جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی تو ان کا علم و بصیرت ان کے کسی کام نہ آیا اور وہ تباہی کے جہنم میں جا گریں۔ اس دعویٰ کی شہادت کے لئے ہمیں تاریخ کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹنے کی ضرورت نہیں۔ خود ہمارے زمانے میں اقوامِ مغرب کی حالت اس کی شاہد ہے علم و عقل کا یہ عالم کہ اس سے پہلے کوئی قوم شاید ہی اس بلندی پر پہنچ پائی ہو، اور اس کے باوجود جہنمی زندگی کی کیفیت کہ شاید ہی کوئی قلب ایسا ہو جس میں اس کے شعلے نہ بھڑکتے ہوں۔ یہ اس لئے کہ ان اقوام نے اپنے حیوانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع نہیں رکھا اور عقل و بصیرت سے مستقل اقدارِ خداوندی کی روشنی میں کام نہیں لیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، عصرِ حاضر کے انسان کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دین کا اساسی اصول یہ ہے کہ انسانی جذبات کو عقل و بصیرت کے تابع رکھا جائے اور عقل و بصیرت سے اقدار و قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے جو وحی کی رُو سے عطا ہوتے ہیں۔

(۰)

یہ تھا وہ دین جسے خدا نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے دیا تھا۔ اس کی روشنی میں، حضور نبی اکرمؐ نے

ایسا نظام متشکل فرمایا جس میں (۱) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم نہیں تھا۔ اس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے تھے۔ (۲) کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں تھا۔ رزق کے سرچشمے ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں تھے۔ (۳) اس میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ختم کر دیا گیا تھا۔ اور (۴) انسانی عقل و فکر پر وحی کی مستقل اقدار کے سوا کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس سے انسانی فکر کو نشوونما کے پورے پورے مواقع حاصل ہو گئے۔ آسمان کی آنکھ نے، صفحۂ ارض پر اس سے زیادہ انسانیت ساز دور اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جس میں کیفیت یہ تھی کہ:

دین کا نظام

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے تھے
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ، مہ کامل نہ بن جائے

یہ نظام تھوڑی دور چلا کہ استحصالی قوتوں (FORCES OF EXPLOITATION) نے پھر سر اُبھارا اور رفتہ رفتہ دین کی جگہ مذہب نے لے لی۔ میں اس وقت، اس تاریخی تحقیق کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ اس تبدیلی کے اسباب و علل کیا تھے، یہ بجائے خویش ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اگر میں نے اسے، اس مقام پر ضمناً چھیڑا، تو نہ صرف یہ کہ میں اپنے موضوع سے دور نکل جاؤں گا بلکہ قلّتِ وقت کی بنا پر دونوں موضوع تشنہ رہ جائیں گے۔[1]

دین کی جگہ مذہب

بہرحال، سلب و نہب کی قوتیں پھر اُبھریں اور دینیت کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔ ان کے پیشِ نظر اوّلین مقصد یہ تھا کہ عقل و فکر کی شمعیں گل کر دی جائیں۔ سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی جائیں۔ اس کے لئے کیا کچھ کیا گیا، یہ بھی تاریخی تفصیل ہے جس میں میں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ اس وقت، میں صرف اتنا اشارہ کر کے آگے بڑھ جانا چاہتا ہوں کہ وہ جسے ہماری تاریخ میں، اشاعرہ اور معتزلہ کی کشمکش کا یوں ذکر کر کے آگے بڑھا دیا جاتا ہے۔ گویا وہ دو فرقوں کے عقائد کی آویزش تھی، وہ درحقیقت مذہب اور دین کی وہی کشمکش تھی جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پاس دلیل و برہان تو ہوتی نہیں۔ اس کا سب سے خطرناک حربہ لیبل تراشی ہوتا ہے۔ وہ ایک لیبل وضع کرتا ہے اور مسلسل پروپیگنڈہ سے اسے اس قدر گھناؤنا اور نفرت انگیز بنا دیتا ہے کہ وہ جس پر اسے چسپاں کر دے، عوام اس کے خلاف امنڈ پڑتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے اس قسم کی لیبل تراشیوں نے کس قدر تباہیاں مچائی ہیں، اس کے لئے تاریخ میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تین چار صدیاں پہلے، یورپ کی اُس تاریخ کا سامنے لانا کافی ہوگا جس میں مذہب اور عقلیت (RATIONALISM) کی معرکہ آرائیاں

---

[1] پرویز صاحب نے اسے اپنی معرکہ آرا تصنیف "شاہکارِ رسالتؐ، عمر فاروقؓ" کے آخری باب میں بڑی تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

انسانیت کے خون سے لکھی ملتی ہیں۔ گوئٹے نے کہا ہے کہ "سب سے وحشت انگیز منظر وہ ہوتا ہے جب جہالت عملاً میدان میں آجائے"۔ مذہب کی علم و عقل کے خلاف جنگ اسی قسم کے وحشت و بربریت کے لرزہ انگیز مناظر پیش کرتی ہے، خواہ وہ کسی زمانے میں لڑی گئی ہو، اور فریق مخالف کوئی سی قوم اور کوئی سا مذہب بھی کیوں نہ ہو۔ ہماری تاریخ میں بھی، عقل و فکر اور علم و بصیرت کے چراغ گل کرنے کے لئے اسی قسم کے ہتھکنڈے چلے۔ اس میں افراد کے ساتھ کیا ہوا؟ اسے چھوڑیئے، انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان لوگوں کی کتابوں کا ایک ایک ورق تلف کر دیا گیا۔ جب اس بحران میں ذرا سکون ہوا، تو رہی سہی

تصوّف اور عقل

کسر تصوّف کی برفانی سِلوں نے پوری کر دی۔ تاریخ فلسفہ سے واقف حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ تصوّف (خواہ وہ کسی نام سے موسوم اور کسی پیکر میں جلوہ فرما ہو) درحقیقت افلاطون کے اس نظریہ کی صدائے بازگشت ہے جس کی رُو سے اس نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل شدہ علم، قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ قابلِ اعتماد وہی علم ہے جو باطنی طور پر حاصل ہو۔ اس طرح مذہب اور تصوّف، دونوں نے مل کر، علم و عقل کے چراغ گل کر دیئے اور اس کا نام 'دین کی خدمت' رکھا۔ لاک نے کہا تھا کہ جو لوگ وحی کا چراغ روشن کرنے کے لئے عقل کے دیئے بجھا دیتے ہیں وہ درحقیقت عقل اور وحی دونوں کے چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی نمایاں مثال ہے۔ یہاں عقل و فکر کے چراغ گل کرنے کے لئے جو کوششیں ہوئیں، ان سے یہ چراغ تو گل ہوئے ہی تھے، ان کے ساتھ ہی قرآن جیسی قندیلِ جہاں تاب بھی ان کی توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں کے فانوسوں میں اس طرح چھپی کہ اس کا صرف نام زبانوں پر باقی رہ گیا۔

اور یہ سب کچھ شخصی حکومتوں کے بل بوتے پر ہوا، کیونکہ شخصی حکومتیں پنپتی ہی اس صورت میں ہیں جب لوگوں کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا جائے۔ اس کا کامیاب ترین طریق یہ ہے کہ معاشرہ پر مسلسل خوف طاری رکھا جائے۔ شخصی حکومتیں قائم ہی خوف کے سہارے رہتی ہیں۔

———(٥)———

میں ابھی ابھی، ان معرکہ آرائیوں کا ذکر کر رہا تھا جو گزشتہ چند صدیوں میں، یورپ میں عقل اور مذہب کے مابین ظہور میں آئیں۔ اس کشمکش میں، بظاہر ایسا نظر آتا ہے جیسے عقل پرستی کی تحریک کامیاب ہوئی اور مذہب کو گرجوں کی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جانا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کا وہاں یہی حشر ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، مذہب، صرف مزعومہ "خدا پرستی" کا نام نہیں۔ مذہب ہر اس تحریک کو کہتے ہیں جو علم و عقل کے چراغ گل کرنے کے لئے اٹھے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ مذہب بڑا سخت جان واقع ہوا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ابلیس کو قیامت تک کے لئے زندہ رہنے کی مہلت دے دی گئی ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ مذہب کے کسی ایک پیکر کو شکست ہوتی ہے تو وہ کسی دوسرے پیکر میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

یورپ میں عیسائیت کو شکست ہوئی تو مذہب ایک اور لبادہ اوڑھ کر مقابلہ میں آگیا۔ اس کے اس

عوامی تحریک

جدید لبادہ کا نام، عوامی تحریک یا (MASS MOVEMENT) ہے جس طرح دورِ حاضر کے آلاتِ جنگ، سابقہ زمانوں کے آلات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہیں، اسی طرح مذہب کا یہ جدید لبادہ، اس کے سابقہ پیکروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مہیب اور تخریبی ہے۔ نیشنلزم، نازی ازم، فاشزم، کمیونزم وغیرہ عوامی تحریکات، مذہب کے انہیں جدید لباسوں کا نام ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں تحریک کہنا غلطی ہے۔ انہیں ہنگامہ، شورش، یا ہیجان (AGITATION) کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تحریک تو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یعنی کاروانِ انسانیت کا، عقل اور وحی کی روشنی میں، آہستہ آہستہ نسیم سحری کی خوش خرامیوں کے ساتھ اپنی متعینہ منزل کی طرف بڑھتے چلے جانا ——— تحریک صرف یہی کہلا سکتی ہے۔ باقی سب، جذباتی تلاطم خیزیوں کی وقتی ہنگامہ آرائیاں ہوتی ہیں جو سیلاب کی طرح امنڈتی ہیں اور چند دنوں کی قیامت خیز تخریب کے بعد، وقت کے سمندر میں جا ڈوبتی ہیں ——— یہی وہ ہنگامے ہوتے ہیں، جن کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ ؎

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے!
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

ایک تو یورپ کی یہ تحریکیں (یعنی مشتعل اور بیباک جذبات کے طوفانوں پر مبنی شورشیں) بڑی ہمہ گیر تھیں۔ دوسرے اس دور میں وسائلِ رسل و رسائل کی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ سے، دنیا کا کوئی گوشہ بھی ان کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ جب ان کے اثر و نفوذ کی عالمگیریت کی یہ کیفیت تھی تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس سے کیسے غیر متأثر رہتے ——— در اصل تو یہ ہے کہ مسلمان اس قسم کی جذباتی تحریکوں کی زد میں سب سے پہلے آنے والی قوم تھی۔ ان کے ہاں صدیوں سے مذہب، یعنی عقل و فکر کے خلاف، جذبات پرستی کا دور دورہ تھا۔ یہ تو وہ "بھک سے اڑنے والا" مادہ (EXPLOSIVE) تھا جسے فتیلہ

ہندی مسلمانوں کی زندگی

دکھانے کی دیر تھی کہ وہ شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ آپ ہندی مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر طائرانہ نگاہ ڈال لیجئے۔ اگر آپ اس مطالعہ کی ابتدا (جنگِ بلقان اور طرابلس) سے کر کے ۱۹۴۷ء تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ایک قوم نہیں تھی، آتشِ سیّال کا طوفانی دریا تھی جو ذرا سے اشتعال پر یوں بھڑک اٹھتی تھی کہ سارا ماحول اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی شعلہ فشانیاں ٹھنڈی پڑ جاتی تھیں اور دیکھنے والی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اس کی ان شرر باریوں سے اس کے ماحول میں تو کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن یہ خود راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد، یہی راکھ کا ڈھیر پھر ایک جھکڑ بن کر اٹھتا اور ساری فضا کو طوفان آمیز کر دیتا۔ اس طوفانِ بلاخیز کی برق رفتاریوں سے یوں نظر آتا جیسے وہ اس جہانِ ناسازگار کے محکم ترین قلعوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر، انہیں خس و خاشاک طرح نذرِ باد کر دیں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جاتا کہ یہ طوفان انگیزی محض بگولے کا رقص تھا جو اپنے ہی گرد گھوما اور خود ہی تھک کر

خاموش ہوگیا۔ لیکن اس کے بعد اس کی یہ خاموشی، وہ سکوت ثابت ہوتی جو سمندر میں تازہ تلاطم خیزیوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ بےکراں سے بلا انگیز موجیں اٹھتیں اور یوں محسوس ہوتا گویا اس جہان پر کی موت قریب آگئی ہے اور اس سیلِ بےپناہ کے سامنے اس کی حیثیت حباب سے زیادہ کچھ نہیں لیکن تھوڑی دیر کے بعد، یہ مضطرب و بےقرار موجیں باہم گر ٹکرا کر غرقِ دریا ہوجاتیں اور سطحِ آب پر ان کا نقش تک دکھائی نہ دیتا۔ اس قوم کی یہ سیمابی کیفیت اس لئے تھی کہ صدیوں کی مقلدانہ مذہب پرستی اور مستبدانہ ملوکیت سے اس کی عقل و فکر کی صلاحیتیں مشل ہوچکی تھیں۔ اور یہ ہمہ تن جذبات بن کر رہ گئی تھی۔ سرسیدؒ نے —— زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ؟ —— تاریکیوں کے اس ہولناک ویرانے میں فکر کی کچھ شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی، لیکن مذہب پرستی کے جھکڑوں نے انہیں چراغِ تہِ داماں بنا دیا —— اقبالؒ نے جب اس قوم کی ان بےمقصد ہنگامہ آرائیوں اور بلاتعینِ منزل صحرا نوردیوں پر نگاہ ڈالی تو اس کے دل دردمند سے ایک ہوک اٹھی اور اس نے ۱۹۳۰ء میں، الہ آباد کے مقام پر، اپنے

اقبالؒ کا مقام

مشہور خطبۂ صدارت میں، اس آہوئے رم خوردہ کے لئے منزل کا تعین کیا اور قوم کو، اس پر، متانت اور سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دی۔ لیکن قوم، جذبات کے ہجوم میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ کسی نے اس رازدانِ راہِ حیات کی اس صدائے رحیل کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور اسے ایک شاعر کا تخیل اور دیوانے کا خواب کہہ کر، حوالۂ طنز و مزاح کر دیا اور خود پھر انہی ہنگامہ آرائیوں میں منہمک ہوگئی۔ ۱۹۳۲ء میں، اقبالؒ کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ لاہور) کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے آغاز میں، قوم کی اس ہنگامہ خیز جذباتیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک کی یہ حالت ہوچکی ہے کہ ایک طرف سے ہمارے کان میں یہ آواز آتی ہے کہ

> اگر ان حالات میں، ہمارے لیڈروں نے، قوم کے لئے کوئی متعین راہِ عمل اختیار نہ کی تو اس وقت دوسروں کی نقالی سے جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ رنگ لا کر رہے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم کا نوجوان طبقہ حوادثِ زمانہ کے سیلِ بےپناہ میں بلا سوچے سمجھے کود پڑے گا۔

تو دوسری طرف سے، ایک نوجوان انتہائے جوش و خروش میں، یہ کہتا ہوا آگے بڑھتا ہے کہ

> عمل کے لئے کسی متعین راستے اور سوچے سمجھے منصوبے کی ضرورت نہیں۔ یہ سبق درسگاہوں کی منطق میں نہیں پڑھایا جا سکتا۔ یہ جذبہ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فضا میں پھیل جاتا ہے تو اپنی منطق آپ مرتب کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حضرت علامہ نے فرمایا کہ

> اس شورش انگیزیوں میں آپ نے اس اجتماع کی صدارت کے لئے ایک مفکر کا انتخاب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہوا ہے کہ ایسے وقت میں قوم کو ایک مفکر کی ضرورت ہے۔ —— اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جس قوم میں فکری صلاحیت

نہیں رہتی، وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

ان کے الفاظ، جو میرے خیال میں، آج پاکستان کے ہر در و دیوار پر، تابندہ حروف میں لکھ دینے چاہئیں یہ تھے کہ (WHERE THERE IS NO VISION PEOPLE PERISH) اقبالؒ کی یہ آواز نغمہ

قائدِ اعظمؒ

قوم کی ہنگامہ آرائیوں کے نقار خانہ میں گم ہو کر رہ گئی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ (NO TRUE VOICE IS EVER LOST) حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی ——— تو ایک ایسا کان بھی تھا جس نے اسے، ان ہنگاموں سے دور بیٹھے، سنا اور اپنے صدفِ قلب میں محفوظ رکھ لیا۔ یہ تھا قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح ——— وہ محمد علی جناحؒ جو فکر و تدبر کا مجسمہ، متانت و سنجیدگی کا پیکر، صداقت و دیانت کا فشردہ، اقبالؒ کی اس مقدس دعا کی حسین آیت تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ ؎

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطرابِ موج، سکونِ گہر بدہ

ہماری ہزار سالہ تاریخ میں یہ پہلی سیاسی تحریک تھی جس میں ہنگامہ آرائی اور شورش انگیزی کا شائبہ تک نہ تھا۔ جو قرآنی فکر کی روشنی میں، سکوتِ دریا میں بطکی سی خاموشی کے ساتھ، جانبِ ساحل رواں دواں چلی جا رہی تھی ——— مانندِ کہکشاں بگریبانِ مرغزار ——— اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے، دس سال کی قلیل ترین مدت میں، ایک قطرۂ خون بہائے بغیر ——— حتیٰ کہ کسی کو ایک گالی دیئے بغیر ——— پاکستان میں وسیع و عریض مملکت حاصل کر لی گئی۔ اور اس طرح ثابت کر کے دکھا دیا کہ قوموں کی تعمیر، فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔ اور اس قسم کی فکری تحریکیں ان قائدین کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز!
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

(٥)

اس طرح یہ فکری تحریک کامیاب ہوئی۔ لیکن جس طرح یورپ میں، مذہب نے اپنی شکست خوردگی کے بعد، عوامی تحریکوں کا پیکر اختیار کیا تھا، بدقسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہب، جو تحریکِ پاکستان کے دوران کونوں کھدروں میں چھپ گیا تھا، پاکستان میں، ایک منظم عوامی تحریک کی شکل میں نمودار ہوا، اور ملک کی فضا کو آندھیوں اور جھکڑوں کی آماجگاہ بنائے چلا گیا۔

(٥)

قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں یہ عرض کر دوں کہ ایسی تحریکیں کن عناصر سے ترکیب پاتی ہیں۔ ان کی خصوصیات اور لوازمات کیا ہوتے ہیں۔ وہ کس قسم کے

عوامی تحریک کے عناصر

لوگوں پر مشتعل ہوتی ہیں اور انہیں کامیاب بنانے کے کیا کیا طریق اختیار کئے جاتے ہیں - یہ ہمارے پیش نظر موضوع کا بڑا اہم اور بنیادی گوشہ ہے - اور خصوصی توجہ کا مستحق -

۱- سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عوامی تحریک کے پیش نظر کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا - اس کے پیش نظر تخریب ہوتی ہے جس کے لئے وہ معاشرہ میں مسلسل خلفشار اور انتشار (CHAOS) پیدا کرتی رہتی ہے - اس کے لئے ضروری ہے کہ عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مشتعل رکھا جائے اور انہیں عقل و فکر اور غور و تدبر کی طرف آنے نہ دیا جائے -

۲- عوامی تحریک میں وہ عوام شامل ہوتے ہیں جو اپنی موجودہ زندگی سے غیر مطمئن بلکہ بیزار ہوں، اور مستقبل کی طرف سے مایوس - اس میں معاشی ناہمواریوں کو بنیادی طور پر دخل ہوتا ہے یوں تو طبقاتی تفریق کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب ابلیس نے ابن آدم کے کان میں "میری اور تیری" کا افسوں پھونکا تھا - لیکن جب کسی قوم میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک طبقہ دیکھتے ہی دیکھتے کوڑیوں سے کروڑوں کا مالک بن جائے تو (HAVES) اور (HAVE-NOTS) کی تفریق بڑی نمایاں ہو جاتی ہے - اس سے نچلا طبقہ اپنی موجودہ حالت سے بے حد غیر مطمئن ہو جاتا ہے - عوامی تحریک چلانے والے اس صورت حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں - ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ حال (PRESENT) کو مسلسل کوستے رہتے ہیں - اس کے ہر گوشے میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں - اس کی خرابیوں کو اچھال اچھال کر نہایت مبالغہ آمیز انداز سے سامنے لاتے رہتے اور اس طرح اس کے خلاف عوام کے جذبات نفرت کو مشتعل کئے جاتے ہیں - مذہب کے نام پر عوامی تحریک کے علمبردار، معاشرہ کی ہر اخلاقی خرابی کا ذمہ دار اوپر کے طبقہ کو قرار دے کر، اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارتے رہتے ہیں - اور عوام کے دل میں یہ یقین راسخ کر دیتے ہیں کہ ان کی مفلسی اور پریشان حالی کی واحد ذمہ دار، اوپر کے طبقہ کی بداعمالیاں ہیں - ہم یا عوام اس کے ذمہ دار نہیں -

۳- اس تحریک کے علمبردار، حال کو اس قدر قابل نفرت دکھانے کے ساتھ ساتھ، مستقبل کو اس قدر درخشندہ و تابناک دکھاتے ہیں کہ مایوسوں اور محروموں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں - وہ ان کے دلوں میں ناممکن الحصول امیدوں کے جگمگاتے چراغ روشن کر دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آگیا تو تم دیکھو گے کہ تمہاری زندگی کس طرح مسرتوں کے جھولے جھولتی ہے - مذہب پرست طبقہ جو ماضی کو اس قدر درخشندہ بنا کر دکھاتا ہے، اس سے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں حال بے حد گھناؤنا نظر آئے، اور جب وہ عوام سے کہیں کہ جس نظام کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ ایک بار پھر سے اُسی قسم کی جنتی زندگی کا نظارہ دکھا دے گا، تو وہ دیوانہ وار لپک کر اس کے پیچھے ہو لیں -

۴۔ عوام کے دل میں موہوم امیدوں کے چراغ روشن کر کے مستقبل کے فریب تخیّل کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی بات متعین طور پر نہ کہی جائے بلکہ اپنے پروگرام کو مبہم لیکن نہایت دلکش اور جاذب اصطلاحات کے پردوں میں پیش کیا جائے۔ متعین اور واضح پروگرام سامنے رکھنے میں نقص یہ ہوتا ہے کہ متبعین (FOLLOWERS) قدم قدم پر ماپنے لگ جاتے ہیں کہ ہم اس نصب العین کے قریب پہنچتے جا رہے ہیں یا نہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو وہ بددل ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اپنے پروگرام کو مبہم رکھنے کے ساتھ، یہ بھی ضروری ہے کہ عوام سے ہر وقت یہ کہتے رہا جائے کہ ——— وہ آئی، تو وہ آئی، دلِ ناصبور صبح ——— ان سے کہا جائے کہ اب منزل دور نہیں۔ بس تھوڑی سی ہمت اور کرو۔ یہ تھوڑے سے بہت تعمیری نشانات جو باقی رہ گئے ہیں انہیں جلدی سے مٹا دو۔ اس کے بعد زندگی کا نقشہ بدل جائے گا۔ عوامی تحریک میں (TEMPO) کا برقرار رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب اپنے متبعین سے کہا جائے کہ منزل دُور نہیں۔ اس ضمن میں اُس گدھے کی مثال نہایت برجستہ ہے، جس کی گردن میں چھوٹی سی لکڑی باندھ کر اس کے اگلے سرے پر گاجر لٹکا دیتے ہیں۔ اس میں ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ اس گاجر کو گدھے کی آنکھ سے ذرا ہی دُور رکھا جاتا ہے۔ اگر اسے لمبے فاصلے پر رکھا جائے تو گدھا اس فریب میں نہیں آسکتا۔ اسی لئے عوام سے کہا جاتا ہے کہ تم اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ پھر دیکھو کہ ہم کس طرح اس نظام کو کل ہی واپس لے آتے ہیں جسے دیکھنے کو تمہاری آنکھیں ترستی ہیں۔

۶۔ عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ حق و صداقت کی حامل صرف ان کی جماعت ہے ——— ان کی تحریک دنیا بھر کی خوبیوں کی واحد مالک ہے۔ یہ خوبیاں کہیں اور نہیں مل سکتیں۔

۷۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ کشاں کشاں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اپنے اندر کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد، وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ جتنی خوبیاں ان کی پارٹی میں بتائی جاتی ہیں، وہ سب ان کے اپنے اندر موجود ہیں۔ اس طرح ان کا وہ نفسیاتی خلا پُر ہو جاتا ہے جو خوبیوں کے فقدان کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ مختلف قسم کی نفسیاتی پیچیدگیوں (COMPLEXES) کا شکار ہو رہے تھے۔ جس طرح ایک شخص پانی میں غوطہ زن ہو کر باہر کی دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، اسی طرح یہ لوگ، اپنی پارٹی کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر، دنیا و مافیہا سے نہ صرف بے خبر ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی طرف سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

۸۔ عوامی تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو عام معاشرہ میں فِٹ نہ ہو سکنے کی وجہ سے اپنے آپ

کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً سرکاری ملازم عام طور پر ساری عمر معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر گویا تھرماس (THERMOS) میں زندگی بسر کرتے ہیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک لق و دق صحرا میں تنہا پاتے ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسے جوہر نہیں جن کی وجہ سے معاشرہ انہیں اپنا لے، تو وہ اپنی تنہائی دُور کرنے کے لئے عوامی تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ــــ!

۹- عوامی تحریک کی کامیابی کے لئے یہ امر لاینفک ہے کہ عوام کو مسلسل مصروفِ حرکت رکھا جائے۔ ان کو لگاتار چلاتے رہیں اور اتنی فرصت ہی نہ دیں کہ کسی جگہ کھڑے ہو کر سوچ سکیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہنگامے برپا کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی عذر تراش لیا جائے۔ اس طرح مسلسل شور و شغب میں مصروف رہنے سے، عوام کی سوچنے سمجھنے کی رہی سہی صلاحیتیں بھی مفقود ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص عوامی تحریک کے نشہ کا خوگر ہو جائے وہ کسی فکری تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اگر وہ کسی ایک عوامی تحریک سے الگ ہو گا تو کسی دوسری عوامی تحریک ہی میں شامل ہو گا۔ چونکہ اسے سکھایا ہی یہ گیا تھا کہ عمل نام ہے ہنگامہ آرائی اور غوغا آرائی کا، اس لئے وہ فکری تحریک کو بے عملوں کی جماعت قرار دیتا ہے اور اس کی طرف رُخ نہیں کرتا۔

۱۰- مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے عوام کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو شل اور ان کے دل میں یہ خیال راسخ کر دینے سے کہ حق و صداقت کی اجارہ دار صرف ہماری پارٹی ہے، ان میں وہ اندھی عقیدت پیدا کر دی جاتی ہے جسے (جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے) انگریزی زبان میں (FAITH) کہتے ہیں۔ (FAITH) کی وضاحت برگسان نے بڑے جامع انداز میں کی ہے، جب کہا ہے کہ "(FAITH) یہ نہیں کہ اپنے متبعین کو دکھا دیا جائے کہ ہم پہاڑوں کو چلا دیتے ہیں.... (FAITH) یہ ہے کہ ایسا سحر پھونک دیا جائے کہ انہیں چلتے ہوئے پہاڑ بھی دکھائی نہ دیں۔" عوامی تحریک کے لیڈر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے متبعین کی نگاہوں کو اس درجہ مسحور کر دے کہ جو حقائق دوسروں کو یونہی نظر آ جائیں، ان کے متبعین لاکھ سمجھانے اور دکھانے پر بھی انہیں تسلیم نہ کریں۔

یہ تو رہے، عوامی تحریک کے لوازم و خصائص۔ جہاں تک اس تحریک کے لیڈر کا تعلق ہے، اس کے اندر بھی چند ایک خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً:-

عوامی تحریک کے لیڈر

۱- وہ اصول پرستی کی جگہ حکمتِ عملی کو اپنا مسلک قرار دے۔ یعنی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جس مصلحت کا تقاضا ہو، بلا جھجک ویسا کر گزرے خواہ اصولوں کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے متبعین کو یہ باور کرا دے کہ اس میں کوئی اصول شکنی نہیں ہوئی۔

۲۔ اسے اس کا کبھی احساس نہ ہو کہ میں نے کل کیا کہا تھا اور آج کیا کہہ رہا ہوں۔ اس "کہہ مکرنے" کی روش کے متعلق وہ اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کرا دے کہ جنگ میں ہر قسم کا حربہ جائز ہوتا ہے۔

۳۔ وہ سرکشی اور قانون شکنی میں لذت محسوس کرے اور اپنے مخالفین کو ذلیل اور حقیر کر کے خوش ہو، خواہ اس کے لئے اسے دوسروں کے خلاف کیسے ہی جھوٹے الزامات کیوں نہ تراشنے پڑیں —— اس طرح دوسروں کو ذلیل کرنا اس کے متبعین کے نزدیک بھی سب سے بڑا احسنِ عمل قرار پائے گا۔ اور وہ اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھیں گے۔

۴۔ اس کے لئے ایسا ضدی ہونا ضروری ہے کہ وہ نہ اپنی کسی غلطی کا اعتراف کرے، نہ کسی دوسرے کی بات مانے۔ وہ اپنے آپ کو ہمہ دان اور محیطِ کل سمجھے۔

۵۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تحریک کی قیادت کو اپنی ذات تک محدود، اور اس طرح اسے (ONE MAN SHOW) بنائے رکھے۔ اس لئے وہ اپنی تحریک میں ایسے لوگوں کو، کبھی بار نہ پانے دے جن کے متعلق اسے خطرہ ہو کہ وہ کل کو اس کے ہمدوش ہو جائیں گے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ عوامی تحریک کی بنیاد، طبقاتی تفاوت کی شدتِ احساس پر ہوتی ہے۔ اس تفریق کو کم اور رفتہ رفتہ ختم کرنے کا فکری اور تعمیری طریق یہ ہے کہ نچلے طبقے کی سطح کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اوپر اور نیچے کی تفریق باقی نہ رہے۔ قرآن کریم نے جنت کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس میں، طبقاتی تفاوت کو اسی طرح مٹایا گیا ہے۔ اس میں محلات کو گرا کر جھونپڑیوں میں تبدیل نہیں کیا گیا۔ اس میں جھونپڑیوں کو اُبھار کر محلات کے برابر لایا گیا ہے۔ لیکن عوامی تحریک میں مشتعل ہجوم ہر تعمیر کو گرا کر زمین کے ہموار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح خوش ہو جاتا ہے کہ ہم نے مساوات پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ یہ وہ مساوات ہے جس کا مکمل ترین نمونہ قبرستان میں ملتا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں —— اندھیرے میں نشیب و فراز بالکل نظر نہیں آتے۔ سب تاریکی کی چادر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ ہیں وہ عناصر جن سے عوامی تحریک ترتیب پاتی ہے۔ اور یہ ہیں وہ محرکات جن کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتی ہے۔ یعنی یہ کہ عقل و فکر کے چراغوں کو گل کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کیا اور مضطرب رکھا جائے اور معاشرہ میں مسلسل خلفشار و انتشار (CHAOS) برپا کیا جائے اور ایسا کرنے کو خدائی فریضہ قرار دیا جائے۔

معاشرہ میں اس اضطرابِ پیہم اور خلفشارِ مسلسل سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کے دل میں ہوسِ اقتدار چٹکیاں لے رہی ہو۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ بالواسطہ انتشار کی اس آگ کو مشتعل رکھنے کا ایندھن فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اور جب وہ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں تو ان کے سامنے بھی کوئی تعمیری مقصد نہیں ہوتا مقصد ان کا صرف اپنی کرسی کو قائم کرنا اور استوار رکھنا ہوتا ہے، خواہ کسی طریق سے ہو۔

——(۰)——

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی، یہاں مذہب کے نام پر، عوامی تحریک کی طرح ڈالی دی گئی۔ ملک میں بدقسمتی سے، غلط نظام زندگی اور ارباب نظم و نسق کی بدعنوانیوں سے، جوں جوں عوام کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی، یہ

کوئی تعمیری کام نہیں

تحریک بھی بڑھتی چلی گئی، اور اس کے ساتھ ہی اس کے تخریبی نتائج بھی اُبھرتے چلے گئے۔ آپ اس تحریک کی تاریخ پر غور کیجئے۔ آپ کو اس میں کوئی تعمیری کام دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے برعکس، اس حقیقت سے ہر شخص آگاہ ہے کہ انہوں نے اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی، ملک کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ یہ مسلسل (CHAOS CREATE) کرتے رہے۔

(۰)

تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ جو تحریکیں، عقل و فکر کے چراغ بجھانے کے لئے جھکڑ بن کر اٹھیں، انہوں نے انسانی تہذیب و تمدن کی عمارات کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس سیلاب بے پناہ کا مقابلہ وہ سلطنتیں بھی نہ کر سکیں جو صدیوں سے پہاڑوں کی طرح محکم چلی آ رہی تھیں۔ جب ~~۱۹۶۸~~ ۱۹۶۸-۶۹ء کے ہنگامے زوروں پر تھے تو میں نے، ان کے آتش برداروں کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ قوم کو قانون شکنی کا خوگر نہ بنائیں۔ انہیں قانون کا احترام سکھائیں۔ قانون شکنی، دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ جب بیگانے اس کا

قوم کو قانون کا احترام سکھائیں

شکار ہو چکتے ہیں تو پھر یہ اپنوں کے خلاف اٹھنی شروع ہو جاتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب ۱۹۴۲ء میں مسٹر گاندھی نے (QUIT INDIA) کی تحریک شروع کی، اور قوم کو قانون شکنی کے لئے بے باک چھوڑ دیا، تو اس نے قائداعظمؒ کو دعوت دی تھی کہ جب، انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا ہمارا اور آپ کا مقصد ایک ہے تو آپ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائیے یا کم از کم اس کی تائید کیجئے۔ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ گاندھی جی! قوم کو قانون کا احترام .... سکھائیے۔ قانون شکنی کا سبق نہ پڑھائیے۔ ایک دفعہ قوم کو اس کی عادت پڑ گئی تو آج جس سیلاب کا رُخ، انگریز کی طرف ہے کل کو اُس کا رُخ خود آپ کی سمت ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے بند باندھنا آپ کے بھی بس میں نہیں رہے گا۔ یہی کچھ میں نے اپنے ہاں کے ان لیڈروں کی خدمت میں عرض کیا تھا جو اس وقت قوم کو قانون شکنی کے لئے ابھار رہے اور اس کے اس عفریتی رقص آتشیں پر جشن مسرت منا رہے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ الٰہ دین کے چراغ کے اس جن کو بوتل سے نہ نکالئیے۔ یہ ایک دفعہ باہر نکل آیا تو اسے دوبارہ بوتل میں بند کرنا خود الٰہ دین کے بس کی بات بھی نہیں ہوگی.... لیکن قوت کے نشہ کی مدہوشی اس قسم کے مشوروں کو کب درخور اعتنا سمجھتی ہے۔ انہوں نے قانون شکنی کی جی بھر کر داد دی۔ ان عناصر کو قوم کا ہیرو قرار دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ جب وہی، قانون شکنی کے خوگر عناصر، ان کے خلاف اٹھتے ہیں تو یہ چیخنے لگ جاتے اور فریاد کرتے ہیں کہ انہیں روکئے۔ لیکن اب انہیں روک کون سکتا ہے؟

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

اور اس کا خمیازہ ساری قوم کو بھگتنا پڑا۔

(۰)

قرآنِ کریم جس دین کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ سرفرازی قرار دیتا ہے اس کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل، فلہذا ابلیسی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے ——— وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو۔

باطل کے نظام

وہ ملوکیت یا آمریت کی شخصی حکومت ہو یا مغربی جمہوریت، عملاً دونوں میں بعض انسان، دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں سیکولر ازم بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا نمائندہ فرعون تھا۔ دوسرے اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلّط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ہامان تھا۔ اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔ اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ قارون تھا۔ قرآن کی رو سے، دین کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹایا نہ جائے۔ لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے، تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ، فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے ——— "یہ تبدیلی پیدا کی جاتی ہے"۔

داخلی تبدیلی

قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ...... (۱۳/۱۱)

جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

یکہ منزل راہمی دانی بہ راہ   قیمتِ ہر شے ز انداز نگاہ!
نوع دیگر بیں، جہاں دیگر شود   ایں زمین و آسماں دیگر شود

قرآن کا مقصد، انسانی قلب و نگاہ میں اسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است   ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب، جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرمؐ اور آپ کے رفقاءِ جلیل کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا ــــــ اس مقام پر میں اتنا اور واضح کردوں کہ قرآن کریم کی رُو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED) میکیاولی سیاست کا اصول ہے۔ قرآن کا نہیں۔ قرآن کی رُو سے، غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے قرآنی انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہیئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے حضور نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلم نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی، لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر، سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہوگئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ: یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ..... تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قواعد و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما اور نکھار بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابنِ آدم حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے ــــــ جان مار کر محنت کرو، اور اپنے لئے کم از کم رکھ کر فاضلہ سب دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دو۔

اس جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:۔

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

اور (۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی۔ اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔

رسول اللہؐ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل[۱] (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے رکن بنے ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تئیس سال تھی اور آپؐ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تئیس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل صرف ہو گئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں، اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے، ان کے نزدیک تو حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی "بے عملی" کا دور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابل برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا۔ نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا۔ نہ کہیں ہنگامہ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا۔ نہ کسی سے بدمعاملگی کی نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے۔ مصیبتیں اٹھاتے رہے لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا، نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زیرِ زمین تحریک چلائی۔ جو کچھ کیا کھلے بندوں کیا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی نہ کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی ——— "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے، اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ سورۃ النور میں ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵) یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ

---

[۱] رسول اللہؐ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے۔ یعنی وہ سالارِ کارواں جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔ مزمل کے یہی معنی ہیں۔

تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ـــــ ایمان ـــــ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اعمالِ صالحہ ـــــ قرآنی اقدار و اصول کے اندر رہتے ہوئے مناسب اقدامات۔

جب یہ جماعت یوں صاحبِ اقتدار ہو گئی تو معاشرہ میں نظامِ اسلامی خود بخود نافذ ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گذرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اس وقت نہ کسی نے یہ سوال اٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ـــــ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد کسی کے دل میں یہ سوال نہ ابھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال کر، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ـــــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے ـــــ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد، اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی تو مقصد حاصل ہو گیا یعنی اسلامی نظام قائم ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدّ و جہد رہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین لوگوں کے ذہن اور دل نشین کرانا۔ اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں مناسب تعلیم و تربیت سے، ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا۔ اور یہی طریق ہر اس شخص اور اس جماعت کو اختیار کرنا ہوگا جو صحیح اسلامی نظام قائم کرنے کی داعی ہو۔

اس مقام پر ہمارا نوجوان طبقہ (جس کے جذبات کو مسلسل مشتعل کیا جا رہا ہے) تلملا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ملک میں غریبوں پر گوشۂ عافیت تنگ ہو رہا ہے۔ انہیں زندگی کے دن گذارنے مشکل ہو رہے ہیں۔ ان کے پاس کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا، نہ رہنے کو مکان ہے، نہ علاج کے لئے چار پیسے، ان پر ہر طرف سے مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کے حقوق تلف ہو رہے ہیں۔ ان غریبوں اور ناداروں کو روٹی کپڑے اور انصاف کی آج ضرورت ہے اور آپ اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اس وقت تک انتظار کرو جب تک قوم میں نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اور نہیں سمجھتے کہ ـــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔ ـــــ ؎

نوجوانوں کا اضطراب

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک!

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک؟

مجھے اپنے ان عزیزوں کی بنیائی تمنا کا پورا پورا احساس ہے اور جہاں تک غریبوں کی مشکلات کا تعلق ہے نہیں شاید معلوم نہ ہو کہ رزق کی ان ناہمواریوں کو ملک میں تو آج ابھارا گیا ہے اور میں گذشتہ بیس سال سے مسلسل

اس کے لئے چیخ رہا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود، میں ان نوجوانوں سے کہوں گا کہ تپ دق کا علاج راتوں رات نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور مریض اور تیمارداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مدت کو صبر و تحمل سے گزاریں۔ اس قسم کی ایک اور مثال لیجئے۔ —— ایک کسان کے ہاں من بھر گندم بیج کے لئے رکھا ہے اور اس کے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ بچوں کی بھوک کا تقاضا ہے کہ وہ اس گندم کو پسوا لائے اور بچوں کو روٹی کھلا دے۔ اس سے بچوں کی دو چار دن کی بھوک کا علاج تو ہو جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی بھوک کا مستقل علاج یہی ہے کہ بیج کو کھیت میں بو دیا جائے اور فصل پکنے تک کا انتظار کیا جائے اور اس دوران میں بچوں کی روٹی کا کوئی اور انتظام سوچا جائے۔

صحیح انقلاب کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور ہماری ہزار تمناؤں اور آرزوؤں، بیتابیوں اور اضطرابیوں کے باوجود، فطرت اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتی جس غالب نے یہ کہا تھا کہ —— کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک —— تو اُسے اس کا بھی احساس تھا کہ —— عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب —— ہماری بیتابیٔ تمنا عشق کی صبر طلبی کے تقاضوں کا بدل نہیں بن سکتی۔ ہمارے یہ نوجوان

چین کی مثال

چین کی مثال پیش کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھئے! انہوں نے چند دنوں میں کتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی بھول یہ ہے کہ وہ اس انقلابی جدوجہد کی مدت کو اس دن سے شمار کرتے ہیں جب وہ محسوس طور پر دنیا کے سامنے آیا جس زمانے میں وہ لوگ نہایت خاموشی سے اس کی تیاریوں میں مصروف تھے، وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے ؎

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گذر جاتی ہیں پروانے پر

جاپان کے مشہور مجلہ پیکنگ ریویو کی ۲۰ر مارچ سنہ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں، انقلاب چین کے قائد ماؤزے تنگ کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا:-

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے، نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ (تحریک کے لئے) نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے طویل المیعاد صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے (اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے) کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

ط یہ سنہ ۱۹۷۰ء میں لکھا گیا تھا۔

آپ سوچئے کہ جب اس انقلاب کے لئے جسے محض خارجی معاشرہ میں برپا کرنا مقصود ہو، اس قسم کے طویل المیعاد صبر آزما پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے تو اس انقلاب کے لئے جس میں غلط معتقدات، نظریات، تصورات، اعمال و افکار کو صحیح نظریات سے بدلنا اور انسانی سیرت و کردار کے ہر گوشے کو ایک جدید قالب میں ڈھالنا مطلوب ہو، کس قدر سکون و ثبات کے ساتھ صبر آزما مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ غریبوں اور محتاجوں کی مصیبتوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیں اور ان کی کوئی مدد نہ کریں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ اپنا نصب العین قرآنی نظام رکھیں جس میں ہر نوع کی غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچا جائے گا۔ اس لئے اس کی طرف اس طرح قدم بڑھائیے کہ ملک میں فساد نہ برپا ہونے پائے۔ اور ضرورت مندوں کی مرفہ الحالی کی شکلیں نکلتی چلی جائیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے دل میں قانون شکنی اور سرکشی کے جذبات ابھارنے کے بجائے، انہیں قرآنی قوانین کا احترام سکھایا جائے۔ ان میں اخلاقِ حمیدہ کی آرزوؤں کو بیدار کیا جائے، ان میں معاملات کو ٹھنڈے دل سے سوچنے اور حل کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے، اور منتہیٰ، افرادِ قوم کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی تبدیلی، قرار دیا جائے۔ اس تبدیلی کی بنیادی شرط ایمان بالآخرت ہے، یعنی اس حقیقت پر کامل یقین کہ انسان کا

ایمان بالآخرۃ

کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتے، اور ان نتائج کا خمیازہ ہر انسان کو بھگتنا ہوگا، خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آجائیں اور خواہ مرنے کے بعد ——— اس ایمان کے بعد، قرآنی قانون کی اطاعت، یا مستقل اقدار کی پابندی، نہ پولیس کے ڈر سے کی جائے گی، نہ قید و بند کے خوف سے۔ یہ چیز، اس شخص کے دل کی آواز اور زندگی کا تقاضا بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جسے اسلامی نظام کہتے ہیں، وہ اس وقت قائم ہوگا جب کیفیت یہ ہو کہ یہ لوگ (اے رسولؐ) اپنے ہر نزاعی معاملہ کے تصفیہ کے لئے تیری طرف رجوع کریں۔ یعنی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں، بلکہ ہر معاملہ میں فیصلہ کرنے والی اتھارٹی کی طرف رجوع کریں۔ اور اس کے بعد: ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○ (۴/۶۵) اور پھر جو فیصلہ تو دے، اس کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کریں کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے خلاف کوئی گرانی

اسلامی نظام کے قیام کی شرط

محسوس نہ ہو۔ جب تک معاشرہ میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو، آپ کسی نظام کو اسلامی نہیں کہہ سکتے خواہ اس کی شکل و صورت کیسی ہی اسلامی کیوں نہ دکھائی دے۔ اور ظاہر ہے کہ قلب و نگاہ میں ایسی تبدیلی ہنگامہ خیزیوں اور زور آزمائیوں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف فکری تحریک سے پیدا ہو سکتی ہے جس کا مقصد، افرادِ معاشرہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہو۔ میں نے، جیسا کہ متعدد بار عرض کیا ہے، تحریکِ پاکستان میں، اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا تو اس لئے کہ میرا ایمان تھا کہ اسلام ایک زندہ نظامِ حیات اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو اور قرآنِ کریم ہر،

غور و تدبر سے یہ حقیقت بھی مجھ پر واضح ہوگئی تھی کہ اپنی آزاد مملکت میں اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب نونہالانِ ملّت کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کی جائے جس سے اُن کی کیفیت یہ ہو جائے کہ مستقل اقدارِ خداوندی کی پابندی ان کی زندگی کا داخلی تقاضا بن جائے اور اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ ہو۔ میں نے اس کے لئے طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جو بتوفیق ایزدی اس اُنیس[1] سال کے عرصہ میں، کامل سکوت و سکون سے اس طرح آگے بڑھتی چلی گئی جس طرح طلوعِ ماہتاب کے ساتھ چاندنی کی حسین چادر، نہایت خاموشی سے، فرشِ صحرا پر بچھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔ یا گوئٹے کے "نغمۂ محمدؐ" میں اس آسمانی ندی کی طرح، جسے اقبالؒ نے ان الفاظ سے دو آتشہ کر دیا ہے کہ ؎

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود
باخود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

اس تحریک نے کبھی کسی ہنگامے میں حصّہ نہیں لیا۔ اس نے قوم کو سوچنا سکھایا ——— اور قرآنی روشنی میں سوچنا سکھایا۔ پاکستان آنے کے بعد، میں نے قوم سے کہا کہ ہم جس قسم کے مسلمان بھی ہیں، ہمارا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس خطۂ پاک کو بیرونی خطرات سے محفوظ اور اندرونی خلفشار سے مامون رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرنا چاہیئے جس سے وہ اسلامی زندگی کا پیکر بن کر اُبھریں۔ اس سلسلہ میں، میں نے پاکستان میں مروّجہ طریق و نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی طرف قوم کی توجہ بالعموم، اور اربابِ حل و عقد کی بالخصوص مبذول کرائی ——— اور اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھا لیکن مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے مقاصد میں منہمک رہے اور جس مسئلہ پر قوم اور پاکستان کے مستقبل کا انحصار تھا اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم آج جس قوم کے ہاتھوں اس قدر نالاں ہیں، یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ وہی قوم ہے جسے ہم بیس بائیس[2] سال سے اپنی درسگاہوں ——— اسکولوں، کالجوں،

تعلیمی نظام

مکتبوں، دارالعلوموں ——— میں تیار کرتے رہے ہیں۔ اس قوم کو بنایا ہم نے خود ہی ایسا ہے اور جب یہ ایسی بن چکی ہے تو ہم اسے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ تم ایسی کیوں ہو؟ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہم موجودہ قوم کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور اسی قسم کی قوم تیار کرنے میں مصروف بھی! یعنی ہم اپنی مروّجہ تعلیم کے برگ و بار سے اس قدر ملولِ خاطر بھی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اسے علیٰ حالہٖ جاری بھی رکھے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی تبدیلی کے لئے تیار نہیں۔

میں نے یہ کچھ سنہ ۱۹۷۰ء میں کہا تھا۔ اس کے بعد دیکھئے تو حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ نہ صرف یہ کہ ہم

(۱، ۲) یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ اب یہ تحریک بعونہٖ تعالیٰ اور بھی زیادہ پھیل چکی ہے۔ (طلوعِ اسلام)

نے نظامِ تعلیم میں کوئی انسانیت ساز تبدیلی نہیں کی، بلکہ اب حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہماری درسگاہیں ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے اکھاڑے بن رہی ہیں۔ پہلے ہنگامہ آرائیاں دست و گریباں تک محدود ہوتے تھے، اب بات بات میں گولیاں چل جاتی ہیں —— کس بات پر گولیاں؟ —— کسی پروفیسر نے کسی طالب علم کی بدتمیزی کا نوٹس لیا تو یا تو وہیں کلاس روم میں، اور یا کمرے سے باہر نکلتے ہی بے چارہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ کسی استاد نے کسی نالائق طالب علم کو ایک پرچہ میں فیل کر دیا تو اسے سٹین گن کا نشانہ بنا دیا —— نتیجہ اس کا یہ کہ کالجوں کے پرنسپل سہمے سہمے پھرتے ہیں اور اساتذہ دبکے دبکے جان بچاتے۔ جو امن پسند طالب علم ان مفسدہ پردازوں کا ساتھ نہیں دیتے، ان کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ خیز طلبہ معاشرہ میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان حالات میں علم و عقل کا نام کون لے سکتا ہے، اور فکر و بصیرت کا ذکر کون کر سکتا! یہ ہیں وہ عناصر جن سے ہماری نئی قوم ترکیب پا رہی ہے۔

دوسری طرف، مذہب پرست طبقہ کو لیجئے۔ پہلے ان کے فیصلے فتاویٰ کی حیثیت رکھتے تھے جن پر خداوندی کی روشنی میں علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رُو سے تنقید بھی کی جا سکتی تھی اور انہیں مسترد بھی کیا جا سکتا —— لیکن اب وہی فتاویٰ عدالتوں کے فیصلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن پر تنقید کرنے والا توہینِ عدالت کے جرم کا مرتکب قرار پا جاتا ہے۔ لہٰذا، فکر و تدبّر کے دروازے زندگی کے اس گوشے میں بھی بند ہیں۔ اگر ان کے کسی فتوے نے ہنوز قانون کی حیثیت یا عدالتی فیصلہ کی شکل اختیار نہیں بھی کی، تو بھی اس پر تنقید کرنے کی بہت کم لوگ ہمت پاتے ہیں۔ ان کے بے پناہ پراپیگنڈہ کا حریف بمشکل ہوا جا سکتا ہے۔

جس معاشرہ کی حالت یہ ہو، سوچئے کہ اس میں فکر و تدبّر کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کے لئے، اقبالؒ کے ان الفاظ کا دُہرا دینا کافی ہوگا جو انہوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں کہے تھے کہ —— "جن قوموں میں فکر مفقود ہو جاتی ہے، وہ تباہ ہو جاتی ہیں!"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس روزِ بد سے محفوظ رکھے!

نظامِ ربوبیت

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے) مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے، کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے —— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

★ کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے —— ضخامت ساڑھے چار سو صفحات —— سنہری جلد —— قیمت فی جلد پچاس روپے علاوہ محصول ڈاک